ترجمے کا فن اور ثقافتی پس منظر

سمیرہ -او
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، شری شنکر اچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت، کیرالا۔انڈیا

ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترسیل خیالات کا عمل ہے۔اس کا مقصد اظہارِ خیال اور اصل کے مفہوم کی وضاحت بھی ہے۔خیالات ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی کے دوران عموماً چند نکات جانے انجانے چھوٹ بھی جاتے ہیں اور چند نکات کا اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔اس کا انحصار مترجم کے شعورِ ذوق پر ہے۔ترجمے میں ذوق وشوق کے سوا بڑی ذہانت، علمی سنجیدگی، صبر ومشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ترجمے کی کامیابی کے لیے مترجم کا وسیع التجربہ، کثیر المطالعہ اور محنتی ہونا بھی ضروری ہے۔اس کو اصل یا مصدری زبان اور زیرِ ترجمہ زبان دونوں پر کامل قدرت حاصل ہونی چاہیے۔اسی طرح نئے نئے الفاظ تراشنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔عمدہ ترجمہ بذات خود ایک تخلیقی فن کا درجہ رکھتا ہے اور ہر ترجمہ دراصل ترجمے کا ترجمہ ہے۔

ترجمے کی مختلف قسمیں:

☆ پابند یا لفظی ترجمہ☆ آزاد ترجمہ☆ تخلیقی ترجمہ

* پابند اور لفظی ترجمہ وہ ہے جس میں اصل زبان کے پورے مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے جو اکثر اوقات ا؟سان اور عام فہم ہوتا ہے۔اس میں ایک عبارت کا لفظ بلفظ ترجمہ کیا جاتا ہے۔اس میں عبارت کا مفہوم پانے کے لیے ہمیں بہت دور تک جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔لفظی ترجمے کو متنی ترجمہ بھی کہا گیا ہے۔

* آزاد ترجمہ وہ ہے جس میں مترجم اصل زبان کے پورے مفہوم کی تفہیم کے بعد لفظی ترجمے کے بجائے اس کا آزاد ترجمہ کرتا ہے۔اس میں زیرِ ترجمہ عبارت میں شامل پورے اہم نکات بے کم وکاست آجاتے ہیں۔اس کو غیر متنی ترجمہ بھی کہا گیا ہے۔اس میں مترجم کو اپنے اظہار بیان میں پوری آزادی کا حق حاصل ہے۔بشرطیہ کہ آزادی مقررہ حدود سے آگے نہ بڑھے۔اس میں ایک مترجم کامیاب بھی نکلتا ہے اور ناکام بھی۔

* تخلیقی ترجمہ آزاد اور پابند ترجمے کی درمیانی کڑی ہے۔اس لیے اسے معتدل ترجمہ بھی کہا گیا ہے۔آزاد ولفظی ترجمہ کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔ جب طلبہ لفظی ترجمہ پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں تو ان کو آزاد تراجم کا گر سکھایا جائے۔تخلیقی ترجمہ کے لیے بڑی ریاضت اور تجربے کی ضرورت پڑتی ہے۔اس کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔یہ سچ ہے کہ تخلیقی ترجمے کو لفظی وآزاد ترجمے پر فوقیت حاصل ہے اور دونوں زبانوں کی باریکیوں اور نزاکتوں سے واقفیت کے بغیر ایک زبان کے خیالات یا خصوصیات کو دوسری زبان میں منتقل کرنا دشوار ہے۔

ترجمے میں زبان کی خارجی خصوصیات کی منتقلی سے بڑھ کر مصنف کے بنیادی خیال کی ترسیل ہی مقصود ہوتی ہے۔بقول نصیر احمد خان (ترجمہ اور لسانیات) ''درحقیقت صحیح اور کامیاب ترجمے اسی صورت میں ممکن ہیں جب ہم لکھنے والے کے ذہن میں نہ صرف سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں بلکہ ان کیفیات اور احساسات سے بھی گزر سکیں جو تصنیف کا ذریعہ بنی ہیں۔ترجمہ محض ایک جسم کو دوسرا لباس پہنا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک جسم کے مقابلے میں بالکل ویسا ہی جسم تراش کر اسے دوسرے لباس میں اس طرح لے آنے کا نام ہے کہ دونوں قالبوں میں ایک ہی روح ہو۔'' یہاں لباس، جسم اور روح سے مصنف نے زبان، مرکزی

خیال اور تاثر مراد لیا ہے۔

ترجمے کی اہمیت:

آج کل کی تیز رفتار دنیا میں آمدورفت کے ذرائع میں وسعت آجانے کے سبب مختلف ملکوں اور ریاستوں میں رہنے والے ایک ملک یا ریاست سے دوسرے ملک یا ریاست کو معاش کی تلاش میں آتے جاتے ہیں۔اس آمدورفت سے ان کے درمیان ایک طرح کا کاروباری رشتہ جڑتا جاتا ہے۔وہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کوشش میں ایک دوسرے کی زبان سیکھنے کو مجبور ہوتے ہیں۔

ترجمہ کے فائدے:

ترجمہ کے ذریعے بہت سارے فائدے اٹھائے جاتے ہیں۔اس کی وساطت سے نئے نئے الفاظ،تراکیب،محاورات،تلمیحات،استعارات کے علاوہ مختلف زبانوں کا اسلوب بیان اور لب ولہجہ بھی ایک زبان سے دوسری زبان میں داخل ہوکر اس میں رچ بس گیا ہے۔ترجمے کے ذریعہ زبان ایک نئے مزاج اور ایک نئی تہذیب سے روشناس ہوکر آگے بڑھتی ہے۔وہ نئے نئے الفاظ اور نئی نئی ساختیں اپنا کر ابلاغ وترسیل کے لیے اچھی خاصی توانائی اور قوّت حاصل کر لیتی ہے۔ترجمہ کے ذریعے نت نئے خیالات واحساسات زبان کے اندر داخل ہوکر زبان کی قوتِ اظہار کو مستحکم کر دیتے ہیں اور اس میں اظہار کے نئے نئے امکانات پیدا کر دیتے ہیں۔آگے چل کر یہ زبان متین اور سنجیدہ خیالات کے بیان کی صلاحیت حاصل کر لیتی ہے۔اس کے ذریعہ ایک زبان کی تہذیب دوسری زبان کی تہذیب سے مل کر ہمارے سامنے نئے نئے گل کھلاتی ہے۔اس معنیٰ میں ترجمے کا عمل انسانی تمدن اور تاریخ کی دریافت اور شناخت کا عمل بھی ہے۔ترجمہ دراصل دیسی زبان کو پردیسی لباس پہنانے کا عمل بھی ہے۔جب زبان کے اندر ہر زبان کے خیالات واحساسات کو سمو لینے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا بھر کی ادبی تخلیقات کو اس میں منتقل کرنے کا کس بل بھی پیدا ہو جاتا ہے۔اس معنیٰ میں ترجمے کی اہمیت مسلم ہے۔دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملکوں میں علم وادب کا فروغ تراجم کے ذریعے ہی حاصل ہوا ہے۔

ترجمہ انسانوں اور قوموں کے درمیاں حائل اجنبیت کی بہت سی دیواروں کو توڑنے میں کام آتا ہے۔وہ ہر عہد کے نئے نئے افکار ونظریات کو ہم تک پہنچاتا ہے، ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے متعارف کراتا ہے۔جدید ادبی میلانات سے ہمیں روشناس کراتا ہے۔بڑے بڑے تخلیق کاروں کی شاہکار تخلیقات میں شامل اچھوتے خیالات وتصورات سے ہماری سوچ کے افق کو کشادہ اور منور کر دیتا ہے، وہ ہماری معلومات میں کافی اضافہ کر کے ہماری زبان کو زیادہ پرکشش اور جاندار بنا دیتا ہے۔اس طرح ہمارے سوچنے کا انداز ہی بدل دیتا ہے۔

ترجمے سے زبان پھلتی پھولتی اور سدھرتی بھی ہے۔ترجمہ سے ہمارے ذخیرۂ الفاظ میں اضافے کی راہ بھی ہموار ہو جاتی ہے۔ترجمہ انسانی علوم کی سرحدوں کو وسیع سے وسیع تر کر دیتا ہے۔ترجمے کے ذریعے ہم مختلف ممالک کے علوم وفنون، وہاں کے باشندوں کے مزاج ومیلانات، ان کے رسم ورواج، رہن سہن، تہذیب وثقافت سے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ساتھ ہی ان کے دکھ درد، خوشی وغمی میں شریک بھی ہو سکتے ہیں۔

ترجمہ دراصل دو زبانوں اور تہذیبوں کے درمیاں ایک پل کا کام سرانجام دیتا ہے۔ترجمہ کی وساطت سے خیالات وتفکرات اور معلومات کے لین دین کا عمل جاری رہتا ہے۔اس باہمی تبادلے سے ہمارے چشم تخیل کو کشادگی ملتی ہے۔مختلف قومیں اور تہذیبیں اپنے جغرافیائی حدود اور مسافت کو عبور کر کے ایک دوسری سے قریب تر ہو جاتی ہیں۔اس طرح ایک بین الاقوامی انسانی برادری کی تشکیل وتعمیر کے لیے راہ ہموار ہوتی چلی جاتی ہے۔اس معنیٰ میں دیکھا جائے تو ترجمہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

تراجم نے نئے اسالیب بیان کو جنم دیا ہے۔نئے طرزِ احساس کو ابھارا ہے، ہمارے پیرائے بیان میں استواری پیدا کی ہے اور اس کے لیے نئے سانچے فراہم کیے ہیں۔ان کے ذریعہ زبان میں نئے نئے الفاظ وتراکیب کا ادل بدل ہوا ہے۔چنانچہ ہم بے تامل کہہ سکتے ہیں کہ ترجمے کا مقصد صرف کسی ایک زبان کے موضوع کو دوسری زبان میں منتقل کرنا نہیں ہے بلکہ ترقی یافتہ زبانوں کے اسالیب کو دوسری مفلس زبانوں میں ڈھالنا اور رائج کرنا بھی ہے۔ترجمہ نے علم

انسانی کے سرمایے میں پیش بہا اضافہ کیا ہے۔ایک کامیاب ترجمہ بجائے خود ایک ایسی تخلیق ہے جو چراغ سے چراغ جلانے کا کام انجام دیتا ہے۔وہ ایک زبان کو دوسری زبان کے خیالات وافکار سے مالا مال کرتا ہے۔اس کے ذریعہ ایک زبان میں دوسری زبان کا وقیع ادبی سرمایہ منتقل ہوکر آتا ہے اور وہ زبان باثروت بن جاتی ہے۔اردو نے ترجمے کی روایت کو ابتدا ہی سے اپنایا ہے۔اس کے ذریعہ ہی اس نے عالمی ادب کے میدان میں اپنا قدم جمایا ہے۔

مختلف تہذیبی ماحول میں پرورش شدہ زبانوں میں یہ ثقافتی اور لسانی عناصر دودھ پانی کی طرح یوں مل گئے ہیں کہ ان کا دیانت دارانہ ترجمہ ہمارے لیے ایک مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔ایک خاص تہذیبی قدر کے حامل ایک لفظ کی جگہ دوسرے لفظ کو بٹھانا ہمارے لیے بے حد دشوار ثابت ہوتا ہے۔ایک تہذیب کا کوئی خاص لفظ جب دوسرے تہذیبی سیاق میں رکھا جاتا ہے تو وہ بھونڈا اور بے معنیٰ معلوم ہوتا ہے۔قدیم زمانے سے ہی بھارت کے غیر ممالک سے کاروباری تعلقات قائم تھے۔عباسیہ دور میں خاص کر خلیفہ منصور عباسی کے دور میں بہت ساری سنسکرت کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔میراں جی خدانما کی عربی سے اردو میں منتقل شدہ ابوالفضائل عبداللہ کی عربی کتاب ''تمہیدات ہمدانی'' کو اردو کا پہلا ترجمہ مانا جاتا ہے تو دوسری طرف فارسی سے اردو میں منتقل کردہ ملاّ وجہی کی کتاب ''سب رس'' کو سب سے پہلا اردو ترجمہ مانا جاتا ہے۔اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں سید محمد قادری کی فارسی تصنیف طوطی نامہ کا ترجمہ ہوا۔اسی زمانے میں فضل علی فضلی نے ملاّ حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب "روض ?الشھدا" کا ترجمہ اردو میں ''کربل کتھا'' کے نام سے کیا۔امیر خسرو کی مشہور مثنوی "ہشت بہشت" کا ترجمہ ۱۵۰۱ھ میں مکمل کیا گیا۔نظامی کی ہفت پیکر" کا ترجمہ "بہرام وگل اندام" کے نام سے ۱۸۰۱ھ میں تکمیل کو پہنچا۔

اردو ادب کا سب سے گراں مایہ زخیرہ مذہبی تراجم ہیں اور ان کے حال واحوال سے متعلق سینکڑوں رسالے اردو میں ترجمہ کیے گئے ہیں۔اردو میں ترجمے کی اجتماعی کوشش کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہوتا ہے۔فارسی کتاب "مفرح القلوب" کے اردو ترجمے ''اخلاق ہندی'' کو پہلا مطبوعہ اردو ترجمہ تصوّر کیا جاتا ہے جو ۱۸۰۳ء میں فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی میں نکالا گیا ہے۔انگریزی ملازموں کو ہندوستانی سکھانے کی خاص غرض سے یہ کالج کھولا گیا تھا۔وہاں ڈاکٹر گل کرسٹ کی سربراہی میں اردو کا ایک باقاعدہ شعبہ قائم کیا گیا۔اس کالج کے مترجمین میں میر امن دہلوی، عبداللہ مسکین، کاظم علی جواں، بہادر علی حسینی، مظہر علی خان ولا، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔اردو میں عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی کے علاوہ بھاشاؤں کے ترجموں کو بھی اردو زبان کی تعمیر اور تشکیل میں بڑا دخل رہا ہے۔علی گڑھ تحریک جیسی مختلف تحریکوں، نول کشور پریس جیسے مختلف مطبعوں، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ جیسے متعدد دارالترجموں، عیسائی مشنریوں اور صوفیائے کرام نے بھی اردو ترجمے کو بڑھاوا دیا ہے۔

1835ء میں انگریزی سرکار نے ایک تعلیمی کمیٹی تشکیل دی تھی۔اس کے تحت دہلی کالج کے پرنسپل J.H Tylor کی رہنمائی میں ایک Vernacular Translation Society تشکیل دی گئی، جس نے ترجموں اور تالیفوں کے ذریعہ نصابی کتب کی کمی پوری کردی۔دہلی کالج کے بعد سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی نے اس کام آگے بڑھایا۔اس نے اردو میں انگریزی کی علمی کتابوں کے ذریعہ ترجمہ نگاری کو خوب رواج دیا۔جب یہ سوسائٹی غازی پور سے علی گڑھ منتقل ہوگئی تو اس کی سرگرمیوں میں تیز رفتاری پیدا ہوگئی۔اس کے قیام کے بعد ملک کے کئی علاقوں میں مختلف انجمنیں ابھر آئیں۔مثلاً بنارس انسٹی ٹیوٹ سائینٹفک سوسائٹی مظفر پور بہار، انجمن تہذیب لکھنو، کٹک سوسائٹی اڑیسہ، انجمن راجپوتانہ وغیرہ۔اسی عہد میں مہاراجہ کشمیر کے دارالترجمہ میں بھی کچھ اہم علمی کتابوں کے تراجم کا کام متوازی جاری رہا۔سرسید اور ان کے رفقائے کار نے کئی انگریزی تمثیلوں اور انشائیوں کا ترجمہ کیا۔سجاد حیدر یلدرم نے ترقی تخلیقات اور پروفیسر مجیب نے روسی تخلیقات کو اردو کا جامہ پہنایا۔ان کے حلقے میں عبدالرحمان بجنوری، ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ شامل تھے۔ترقی پسند تحریک کے بعد حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ ادباء نے بھی مختلف عالمی زبانوں کے شاہکاروں کے تراجم سے اردو کو مالا مال کیا۔ان میں منٹو، عزیز احمد، حامد علی خان، سجاد ظہیر، ابن انشا، میراں جی، ظ انصاری، اختر حسین رائے پوری، قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر عبدالحق، قاضی عبدالغفار، حسن عسکری، ڈاکٹر ذاکر حسین، عابد حسین، آل احمد سرور وغیرہ شامل تھے۔

ہندوستان میں ادب کے ترجمے نے ایک باقاعدہ رجحان کی صورت آزادی کے بعد ہی حاصل کی ہے۔سرکار نے بھی اپنے اشاعتی اداروں کے

ذریعے اس رجحان کی ہمت افزائی کی۔اب ترجمے کا رجحان دیسی ادب کے ترجمے اور تقابلی مطالعے کی طرف ہوگیا ہے۔قومی ایکتا اور ذہنی یکجہتی کو بڑھاوا دینے کے مقصد سے مختلف دیسی زبانوں سے براہ راست اردو میں ترجمے ہورہے ہیں۔سرکار اس میں مترجم کا تعاون بھی کررہی ہے۔ اردو ترجمہ نگاری کا سندھی کورس بھی جاری کیا گیا ہے۔

زبان کا وجود جتنا قدیم ہے ترجمہ کا وجود بھی تقریباً اتنا ہی پرانا ہے۔ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ دراصل بہت صبر آزما عمل ہے۔کیوں کہ اس عمل میں مترجم کو خیالات کی ترسیل کے ساتھ ساتھ بیان کی ندرت ونزاکت کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔کیوں کہ فرد کے افکار وخیالات کو اس کے اسلوب بیان سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ترجمہ دراصل مصدری زبان میں موجود خیالات وتاثرات کو کسی طرح کی کمی کے بغیر ہدفی زبان کے مزاج سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اجاگر کرنے کا نام ہے۔اس میں جتنی اہمیت خیالات کی منتقلی کو دی جاتی ہے،اتنی ہی اہمیت اسلوبِ بیان کو بھی دی جاتی ہے۔ایک مترجم کے لیے مصدری اور ہدفی دونوں زبانوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ مترجم جس موضوع پر قلم اٹھائے،اس سے گہری واقفیت کے ساتھ اس کا ذوق رکھنا بھی اس کے لیے ضروری ہے۔ اس کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے زبان کے ساتھ اسلوب،موضوع،ثقافت وغیرہ پہلوؤں کا دھیان رکھنا بھی بے حد ضروری ہے۔مختلف زبانوں کے ادبیات کا باہمی لین دین اور ادیبوں کے درمیان جاری ترسیل خیالات،زبان وادب کے فروغ کے لیے مفید ثابت ہوئے ہیں اور یہ عمل بہ ذریعہ ترجمہ انجام پذیر ہوتا ہے۔ اردو زبان کی نشو ونما بھی بے شمار تراجم کی مرہون ہے۔اردو زبان وثقافت کی ترویج وتوسیع میں تراجم نے بڑا رول ادا کیا ہے۔الغرض ترجمہ کے بغیر کوئی زبان جدید ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔

Sameera O

Research Scholar Dept. of Urdu

S.S.U.S Kalady, Kerala

Email: sameeraoruvingal@gmail.com

☆☆☆